ادبی تاریخی شعور اور اقبال

صائمہ انجم النسا[1]م ڈاکٹر محمد افضل حمید**

Abstract:

"A higher creation is a reflection of its age, of the past and of the age to come. No creator can create something without linking his thoughts to historical consciousness or traditions. This historical consciousness is not inherited, but it requires a great deal of exercise. With its help, creators incorporate these traditions, ideas or practices into their creations, which lead to the continuity of a civilization and society. Modern aesthetics says that in the process of creation, the artist is active with all his senses and mental states and he recreates the new in the presence of the old.His mind sinks into the deepest depths and establishes its relationship with the best experiences of the human mind.Iqbal was fully aware of the importance of this relationship between history and creation. His poetry and prose is a wonderful combination of tradition and innovation."

یہ طے ہے کہ ادب ایک روحانی سرگرمی، تخلیقی کارنامہ اور تہذیب انسانی کا مخرج ہے۔ فنی تخلیق بے شمار تجربوں اور بصیرتوں کا نچوڑ ہوتی ہے۔ا س پر دوسرے حالات کے ساتھ ساتھ سماجی اقتصادی صورتحال بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ چونکہ ادیب اپنے عہد اور معاشرے کا حساس انسان ہوتا ہے لہذا وہ زندگی کے حقائق اور تاریخی تصورات کا دوسرے افراد کی نسبت زیادہ قوی شعور رکھتا ہے۔ تخلیق اور تاریخ کا تعلق ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں انیس ناگی لکھتے ہیں:

> ''تخلیقی فنون میں ماضی کی شمولیت ناگزیر ہے مگر مسئلہ انتخاب اور اتصال کا ہے کہ فن کار ماضی کا ادراک کس طرح کرتا ہے اور اسے اپنے عہد سے کس طرح متصل کر سکتا ہے؟ ہمارے یہاں اردو ادب میں روایت کا تصور ماضی پرستی سے وابستہ ہے ۔بالخصوص شعری ادب میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ماضی کے شعری اسلوب کے اعادہ اور تکرار سے فن کار روایت سے منسلک رہتا ہے جو یہ فرض کرتے ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں کہ روایت ایک حرکی عمل ہے،جو خارجی حقائق کے تغیرات سے اپنے باطن میں تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔''(1)

تاریخی شعور کی مدد سے ادیب کو ماضی کی لسانی، فکری اور ہیئتی روایتیں ڈھلی ڈھلائی ملتی ہیں۔ کلاسیکیت اسی کا نام ہے۔ ادباءاور شعرااسی کلاسیکیت کو کام میں لا کر اس کو اپنی خلاقی سے ترمیم اور اضافے کے ساتھ پیش کرتےہیں ۔ جو آئندہ نسلوں کے لیے روایت یا تاریخ بن جاتا ہے۔ادبی تاریخی شعور میں ادیب زبان کے پیرائے، اصطلاحات، انتقاد کے تصورات، اصناف، ہیئتیں ، صنائع بدائع، کنائے، علامتیں، اور تلازموں میں نیا پن اور تازگی پیدا کر کے انھیں نئے معنی و مفہوم میں پیش کرتا ہے۔ اپنی فکر کو تاریخی شعور یا روایت سے منسلک کیے بغیر کوئی بھی تخلیق کار فطری تخلیق نہیں کر سکتا۔ یہ تاریخی شعور ورثے میں نہیں ملتا بلکہ اس کے لیے بے تحاشہ ریاضت درکار ہے۔ اس کی مدد سے تخلیق کار ان روایات تصورات یا معمولات کو اپنی تخلیق کا حصہ بناتے ہیں ،جو کسی تہذیب

---

[1]پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
** ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

اور معاشرے کے تسلسل کا باعث ہوتے ہیں۔

ہر گزرتا ہوا لمحہ اگلے پل ہی ماضی بن جاتا ہے، اس حوالے سے اگر ہم تاریخی شعور کو سمجھیں تو عصر کا تعلق، وقت، عہد یا دور سے ہے ۔ اور یہ دور پرانا بھی ہو سکتا ہے اور نیا بھی۔ اور آنے والا بھی۔ یوں تاریخی شعور تینوں زمانوں ماضی، حال اور مستقبل تینوں کی اکائی کانام ہوا۔ ادب عالیہ میں ان تینوں زمانوں کا ادراک موجود ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی اعلیٰ تخلیق اپنے عہد کی بھی عکاس ہوتی ہے، گذشتہ کل کی بھی اور وہ ہر آنے والے عصر کی بھی شاہکار ہوتی ہے۔ تاریخی شعور اور تاریخ میں فرق یہ ہے کہ تاریخ ، واقعات کا تحریری بیان ہے جب کہ تخلیق کار کے پس پردہ کارفرما تاریخی شعور ، اعلیٰ حقیقتوں کی بصیرت کے طور پر تخلیق کار کے فن میں نظر آتا ہے، جیسے تلمیح ۔تاریخی شعور واقعاتی اظہار کا نام نہیں بلکہ کسی واقعہ سے حاصل شدہ تاثر اور تجربہ ہے۔ اس سے مراد کسی بھی عہد کے معاشرتی، تہذیبی، علمی اور فکری سطح پر رونما ہونے والے مقبول واقعات، خیالات یا انکشافات کی آگہی ہے۔ اس آگہی کے بغیر اعلیٰ ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔تاریخی شعور دراصل زمانے کی روح کی بصیرت اور فہم کا نام ہے۔ تاریخی شعور کا اثر تخلیق کار کی تخلیق پر کس قدر ہوتا ہے اس ضمن میں یہ اقتباس دیکھیے:

> ''اس نظریہ کی رو سے ادیب اپنے عہد کی پیداوار ہے۔ وہ کسی خاص نسل سے وابستہ ہے اور ایک مخصوص نوعیت کے سماج میں جنم لیتا ہے۔ علاوہ ازیں کسی خاص مقام اور تاریخی لمحہ کے مخصوص اثرات مل جل کر اس کی تشکیل کرتے ہوئے ادبی شعور اور تخلیقی استعداد کو کسی مخصوص سانچے میں ڈھال کر خاص طرح کا پیرایہ اظہار عطا کرتے ہیں۔''(2)

اقبال کی فکر مذہب اور فلسفے کے اشتراک /امتزاج سے وجود میں آئی۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ قدامت پسند تھے یا انھیں تقلید یا ماضی پرستی سے کوئی علاقہ تھا، بلکہ و ہ ہر واقعہ کو عقل ،علم اور منطق کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ وہ تحرک اور تبدیلی کو ضروری گردانتے تھے اور ہر لحظہ جدو جہد اور تگ و دو کےقائل تھے۔ رک جانا اور جمود کا شکار ہونا ان کے لیے گویا موت کا پیغام تھا:لکھتے ہیں:

چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں(3)

اقبال ماضی سے حاصل شدہ بصیرت کی روشنی میں حال اور مستقبل کے لیے راہِ عمل متعین کرنا چاہتے ہیں، اسی لیے کہتےہیں:

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں(4)

اقبال فنون لطیفہ کی جمالیاتی اقدار پر گہری نظر رکھتے تھے''آرٹ اور اخلاق ''، ''آرٹ اور زندگی'' کے رشتے کے متعلق وہ وسیع زاویہ نظر رکھتے تھے۔ وہ تخلیق کے پر اسرار عمل میں تاریخ، سائنس، فلسفہ اور مذہب کی حدود کو جانتے تھے اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ انھی عناصر کی موجودگی میں فن لا محدود ہو جاتا ہے۔ اقبال کے افکار ماضی کی اعلیٰ روایات، انسان کے پورے سفر کی بصیرت، اسلام کی تیز تر روشنی، یورپ کے افکار و خیالات اور ایشیا کی تہذیبی روایات کاخوب صورت امتزاج ہیں۔ ماضی کے تجربوں، موجودہ صدی کے حالات اور انسانی شکست و ریخت سے ان کے ذہن کا گہرا رشتہ ہے۔انسان کیا ہے؟ اس کا مقام اور دائرہ کار کیا ہے؟ اس کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کس طرح سے ہوتی ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ازل سے انسان کے سامنے طرح طرح سے درپیش رہے، فلسفہ اور سماجیات کے یہ بنیادی سوال اقبال کی فکر میں نئی نئی شکلوں سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ وہ ماضی کے فنکاروں کے تجربوں کو اپنی تخلیقی بصیرت کی موجودگی میں نئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اقبال کے سامنے ماضی کے ادب کے دو طرح کے مکتبہ ہائے فکر تھے ایک طرف تو وہ ادب جس میں آسانی، خود فراموشی اور غلامانہ زہنیت، خودی اور اخلاقی اقدار کی گراوٹ اور آزادی فکر کی کمی جیسے

مضامین تھے۔دوسری طرف ایسا ادب جو اعلیٰ انسانی روایات اور اخلاقی اقدار سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ اقبال چونکہ فنونِ لطیفہ کو زندگی سے گہرے اور با معنی رشتے میں پیوستہ خیال کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنی نظم و نثر میں اخلاق، آزادی، جذبہ عمل،قوت و سطوت ،احساس خود داری، نگاہِ شوق، ذوقِ نظر، سوزِحیات اور عظمت انسان کے موضوعات بیان کیے ہیں ،جو کہ نسلِ انسانی کے تمام تر تجربے سے معمور ہیں۔ جدید جمالیات کہتی ہے کہ تخلیقی عمل میں فنکار اپنی تمام تر حسی اور نفسی کیفیات کے ساتھ متحرک ہوتا ہےا ور وہ پرانے کی موجودگی میں نئے کی تخلیق نو کرتا ہے اس کا ذہن عمیق گہرائیوں میں ڈوب کر انسانی ذہن کے بہترین تجربات سے اپنا رشتہ قائم کر لیتا ہے۔ یوں تخلیق محض اس کا عہد کا جلوہ نہیں دکھاتی بلکہ پورے سفر انسانی کی روداد بن جاتی ہے اور اس جلوہ صد رنگ سے ہزار ہا معنی خیز پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے آرٹ کو فلسفہ پر فوقیت دی ہے۔ ان کے نزدیک فلسفہ انسانی تعقل کی بر فیلی رات میں کانپتا ہوا جوہر ہے اور آرٹ اس کو معروضیت کی حرارت بخشتا ہے۔

اقبال کے نزدیک تخلیقی عمل کے لیے زندگی اور اس کی سچائیوں کی حساسیت کے لیے عشق کی ضرورت ہے، کیونکہ جذبہ عشق آرٹ کو ''معجزہ '' بنا دیتا ہے۔ مسجد قرطبہ کی تخلیق میں انہیں یہی مستیٔ عشق اور خونِ جگر نظر آتا ہے۔ اقبال کے آرٹ اور فنونِ لطیفہ کے تصورات میں قدیم مسلمان صوفیوں کے تصورات ، ہندی، یونانی اور وسط ایشیائی افکار کی آمیزش نظر آتی ہے جو ان کے قدیم فنون لطیفہ اور تصورِ حسن کےتاریخی شعور کا پتہ دیتی ہے۔

روایت اور کلاسیکی شاعری کو حسن کے افلاطونی نظریے نے شدت سے متاثر کیا۔ غالب کے عظیم تر رومانی ذہن نے اس تصور میں بڑی جامعیت، تہہ داری اور معنویت پیدا کی۔ سر سید تحریک اور حالی کے اخلاقی تصورات بھی ا سی دائرےکے اندر رہے۔ اس دور کے انقلابی خیالات بھی اس تصور کی شدت کو کم نہیں کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغرب میں فنون لطیفہ کی جمالیات کے نئے نئے تصورات سامنے آئے۔ شیلر، روسو، ولیم بلیک، ورڈسورتھ، شیلے، کیٹس اور بائرن وغیرہ کی رومانیت نے نئے جمالیاتی تصورات کو ابھارا۔ اس کے بر عکس سنسکرت اور فارسی ادبیات نے اپنی کلاسیکی اقدار کو قائم رکھا اور نوافلاطونی تصورات میں کشش محسوس کی۔ حافظ اور عمر خیام کلاسیکی اقدار کی علامت بن گئے۔

اقبال نے جس دور میں آنکھ کھولی اس میں کلاسیکی شاعری اور مغربی رومانیت ہر دو کا چرچا اور دور دورہ تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی اقبال فارسی شعراء کے ساتھ ساتھ مغربی شعراء سے گہری ذہنی وابستگی رکھتے تھے۔ جس کا اظہار ان کی ابتدائی شاعری میں نظر آتا ہے۔ جیسے کہ حسنِ فطرت کا اظہار۔ اقبال کے تاریخی شعور کے مطالعہ میں ہمیں اسی فکری پس منظر کا مطالعہ مقصود ہے۔ پوری تہذیب و تمدن میں اٹھارویں صدی میں روسو کی Egoticism(ایغویت) کو کانٹ ، نٹشے، ہیگل، شوپنہار اور کالرج نے مزید نمایاں کیا۔ اقبال نے قیامِ یورپ میں ما بعد الطبعیات، فلسفہ، منطق، نفسیات، عمرانیات اور معاشیات کا گہرا مطالعہ کیا۔ چنانچہ اقبال پر اس دور کے مغربی نظریات کا بلا شبہ گہرا اثرپڑا تاہم مشرقی اقدار کی موجودگی میں ان کے تجزیاتی ذہن نے انہیں حقیقت سے قریب تر رکھا ۔

انیسویں صدی کے وسط میں مغر ب میں رومانی تحریک کے زیر اثر نئے رجحانات سامنے آنے لگے تھے۔ کار لائل کی ہیروشپ، ایچ جی ولسن کی تخیل نگاری اور جارج برنارڈشا کے فرد کی قوت کے نظریات نے فرد کی طاقت اور اہمیت کا احساس اجاگر کیا۔ مارکس کی جدلیاتی مادیت نے فلسفے میں ایک نئے باب کو کھولا۔ برگساں نے تصورِ وقت میں ایک نئے بعد کے اضافے کی نشاندہی کی۔ سگمنڈ فرائیڈ اور ایڈلر کے تصورات بھی راہ پا چکے تھے۔ اقبال ان تمام رجحانات سے پوری طرح واقف تھے۔ اس کے ساتھ آپ تاریخ اسلام، سیرت پاک اور قرآن حکیم کی تعلیمات سے پوری آگہی رکھتے تھے۔ کائنات، خالق اور مخلوق کے تعلق خصوصاً فرد کی آزادی، کائنات کی تسخیر، انسان کی تخلیقی صلاحیت،

زمان و مکاں اور فردو جماعت جیسے حکیمانہ موضوعات قرآن حکیم کے بنیادی موضوعات ہیں ۔چنانچہ اقبال نے ان موضوعات کو سیرت پاک اور قرآن حکیم کے عمیق مطالعہ سے سمجھنے اور جاننے کی کوشش کی۔

اقبال مسلمان صوفیاء اور علماء خصوصاً مولانا روم اور الغزالی کے خیالات و تصورات سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ انہوں نے یونانی اور جرمن جدید فلسفے کو اسلامی افکار کی روشنی میں جانچا۔ خصوصاً انسان کامل سے متعلق مسلمان مفکرین الغزالی، ابن عربی، رومی اور ابن سینا کے فکر انگیز تخیلات کا مطالعہ کافی گہرائی سے کیا۔ مولانا روم کی مثنوی معنوی میں مردِ کامل کا جو پیکر ابھرا اقبال اس سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اقبال کے تصور حسن و عشق، خودی اور فرد کی تخلیقی صلاحیتوں پر ان کے زبردست اعتماد کے پیچھے انہی سچائیوں کا تاریخی شعور کا ر فرماہے۔ ضرب کلیم میں لکھتے ہیں:

مقصود ہنر سوزِ حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا[5]

اقبال ایک نابغۂ روزگار تھے۔ وہ ماضی، حال اور کافی حد تک مستقبل کی بھی شنید رکھتے تھے۔ یہ استعداد وہبی بھی تھی اور کسبی بھی کیونکہ اقبال کی نثر اور شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے نامور مفکرین، شعرا، ادبا و حکمااور مذہبی رہنماؤں کا ذکر اس میں موجود ہے۔ ''جاوید نامہ'' میں اقبال نےغالب، قرۃ العین طاہرہ، ملا طاہر غنی، بھرتری ہری، حلاج اور ملا ناصر خسرو علوی کا ذکر کیا ہے۔

غالب و حلاج و خاتون عجم
شور ہا افگندہ درجانِ حرم[6]

یہ تمام احباب کسی نہ کسی حوالے سے ذہنی انقلاب اور نظامِ نو کے متمنی تھے۔ ان شعراء کے تذکرہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اقبال ان کے افکار سے پوری طرح با خبر تھے اور یہی ادراک شعر کا محرک بنا۔ شعر گوئی کی ایک خاص روش جسے اقبال عجمی لے کہتے ہیں اس کی تاریخی معنویت کیا ہے؟ اس لے سے مراد دلکش اور دل فریب پیرائے میں نرم لفظوں کی لوری سے انسانی ذہن کو ذوقِ عمل سے محروم کر دینا ہے گویا یہ ذہنی موت ہے۔ عجمی لے کانمائندہ شاعر، اقبال حافظ کو قرار دیتے ہیں ۔چنانچہ اقبال اس عجمی لے کی ہلاکت آفرینیوں کا اندازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حافظ کا ایک شعر ہلاکو اور اس قسم کے دوسرے غارت گروں سے کہیں زیادہ تباہی کے سامان پیدا کر سکتا ہے۔ بلکہ عجمی لے کی ہلاکت آفرینیوں کی کوئی حد ہی نہیں۔ اقبال اس تاریخی حقیقت کے شناساہیں کہ جو قومیں پہلے ہی سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں ان کے حق میں تو یہ عجمی لے گویا زہرِ قاتل ہے۔ کیونکہ یہ انھیں ذوق عمل سے محروم کر کے اپنے مقدر پر قانع ہو جانے کا درس دیتی ہے۔ اقبال اس کا اظہار شاعری میں یوں کرتے ہیں:

تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے[7]

اقبال وسیع المطالعہ ہونے کے سبب نہ صرف ہندی بلکہ عربی، فارسی اور فرنگی ادبیات کے اسرارو رموز سے بھی پوری طرح با خبر تھے۔ وہ اپنی اس بصیرت کی طرف اشارہ اپنی اس رباعی میں خود کرتے ہیں:

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی
نفس ہندی ، مقام نغمہ تازی
نگہ آلودہ انداز افرنگ
طبعیت غزنوی ، قسمت ایازی[8]

وہ کلاسیکی ادبی روایت کے پیچ و خم سے پوری طرح آشنا تھے، خصوصاًاقبال کو فارسی سے نسبت خاص تھی۔لہذا فارسی شعراء کے کلام کو انہوں نے خصوصی ذوق اور شوق سے پڑھا اور ان کے محاسن و معائب کو خوب جانچ پرکھ کے بعد سامنے لائے ہیں۔

اقبال کی تشبیہات اور علامات میں بھی ایرانی علامات جیسے جم اور تختِ جم وغیرہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ایرانی ادبیات کے ساتھ ساتھ اقبال عربی تمدن اور ادبیات کا بھی گہرا شغف رکھتے تھے۔ ان کے اشعار میں جا بجا تلمیحات نظر آتی ہیں، مثال کے طور پر ان کایہ شعردیکھیے:

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزِ د پرم(9)

اقبال تمام تر کلاسیکی شعری صنعتوں اور اساتذہ کے ہاں ان کے استعمالات کا تاریخی ادراک رکھتے تھے۔ انہوں نے کم و بیش تمام صنائع معنوی بڑی ہنر مندی سے استعمال کیے ہیں۔ تضاد، حشو ملیح، مراعات النظیر، حسن تعلیل، ایہام اور ایہام تناسب سے زیادہ کام لیا ہے۔اقبال کی تلمیحات ان کے گہرے تاریخی ادبی شعور پر شاندار دلالتیں ہیں:

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشہ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے(10)

1857ء سے پہلے اردو شاعری میں غزل وہ اہم ترین صنف تھی جس نےسب سے زیادہ نام کمایا۔ لہذا اس وقت شاعر اسی کو خیال کیا جاتا تھا جو غزل گوئی میں کمال رکھتا ہو۔ چنانچہ اس تاریخی روایت کی موجودگی میں اقبال نے بھی اپنی شاعری کا آغاز روایتی غزل گوئی سے کیا۔ اس دور کی نمائندہ غزل :

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی(11)

اقبال کی اس غزل پر اس وقت کی کلاسیکل غزل کی چھاپ نظر آتی ہے۔تاہم اس میں بھی وہ سیمابی کیفیت اور سوز نظر آتا ہے جو آگےچل کر پیامبر اقبال کی صورت میں منتج ہوا۔ ان کی اس وقت کی فنی تخلیقات میں گرچہ بہت کم لیکن کسی حد تک دنیا کے عوامل و حوادث کی جھلک ہمیں شہر آشوب وغیرہ کی صورت میں نظر آتی ہے۔ علامہ اس بات کا پورا ادراک رکھتے تھے کہ انیسویں صدی کے شعراء اور انشا پردازوں نے تغزل اور تصوف کو زندگی سے فرار حاصل کرنے کے وسیلہ کے طور پر لیا ہے ۔ اور اس میں افشائے فکر کی بجائے اخفائے فکر کا پہلو زیادہ روشن ہے۔ لیکن ادبی لحاظ سے اس دور میں شعری روایت کے تمام علائم و رموز معین ہو چکے تھے۔ اصطلاحات، استعارات، تشبیہات اور تلمیہات کا قیمتی ذخیرہ جمع ہو چکا تھا۔ چنانچہ اقبال کواردو کلاسیکی شعری روایت کا وسیع اور معنی خیز سرمایہ حاصل ہوا۔ اور اقبال نے ان کو خوب برتا بھی ۔ اقبال نے سر سید اور حالی سے کافی استفادہ کیا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے شعری تخلیقی شعور کا محرک سر سید اور حالی کے اسلوب فکر و اظہار کا تاریخی شعور اور بصیرت تھی۔

اقبال نےاپنے زمانہ طالب علمی میں ہی گلستان ، بوستان، سکندر نامہ، انوارِ سہیلی اور ظہوری ،میر حسن سے پڑھیں ۔ جنھوں نے اقبال کے اندر فارسی ادب سے واقفیت پیدا کی ۔ اقبال نے اپنے اشعار میں جو مختلف فارسی شعرا کی تضمین کی ہے۔ وہ ان کے اسی فارسی ادبیات کی تاریخی بصیرت کا شاخسانہ ہیں۔ فارسی کی شعری روایات اور رموز پر اقبال کو مکمل قدرت اور عبور حاصل ہے۔ اور انہوں نے ان تاریخی اور روایتی علامتوں سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کے کلاسیکی معنی بھی برقرار رکھے اور نئی معنویتیں بھی عطا کی ہیں، ''شمع اور شاعر'' میں گلشن سے ملت اور قوم مراد لی ہے:

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی

پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا[12]

اقبال نے چونکہ کچھ عرصہ داغ سے تلمذ رکھا اور وہ تمام رموز و علائم جو داغ کی شاعری میں موجود تھے، اقبال نے ان کا گہرا شعور حاصل کیا اور ان علامات کو اپنے سیاسی، ملی اور فلسفیانہ افکار کے ابلاغ و اظہار کے لیے نئی معنویت دی۔ اور اپنے وسیع مطالعے اور بصیرت کی بناء پر ان قدیم علائم او ررموز کو نہایت دقیق افکار اور لطیف تصورات کو جذبے میں سمو کر نئے معنی و مفہوم عطا کیے۔

مغربی ادبی شعور

اقبال کی چشم بصیرت نے مغربی مصلحین، مفکرین، شعراء اور علماء کے افکار سے بہت کچھ کشید کیا ہے۔ انہوں نے ان کے افکار کو بعض جگہ پرنہ صرف قبول کیا ہے ، بلکہ تنقید اور اختلاف رائے سے بھی کام لیا ہے۔ اور ان کے تفکرات کے رد میں دلائل پیش کیے ہیں۔ اقبال کے ہاں ابتدائی شاعری میں مغربی ادبی شعور کی جھلکیاں بہت واضح دیکھی جا سکتی ہیں۔ بانگِ درا کے حصہ اول میں کئی نظمیں ایسی ہیں جو مغربی شعراء سے ماخوذ یا متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ ''ایک مکڑا اور مکھی'' ، ''ایک پہاڑ اور گلہری'' ،''ایک گائے اور بکری''، ''بچے کی دعا'' وغیرہ بطور مثال دیکھی جا سکتی ہیں۔ بعض نظموں میں مغربی شعراء کے خیالات سے استفادہ، بعض اشعار کا ترجمہ اور بعض کے اسلوب کا اثر قبول کیا ہوا نظر آتا ہے۔ ''شذرات فکر اقبال''میں مغربی شاعر ''ملٹن'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کوئی شاعر اپنے مقصد میں اس سے زیادہ مخلص نہیں گزرا۔''[13]

آسکر وائلڈ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس کی روح انگریزی سےزیادہ ایرانی ہے۔ اس کے علاوہ میتھیو آرنلڈ،جرمن مفکر فریڈرک ہیگل کے نظام فلسفہ اضداد کا ذکر بھی کیا ہے۔ مشہور جرمن فلسفی کانٹ (1724ء تا 1804ء) کو فکر انسانی کے حوالے سے سراہا ہے۔ ورڈزورتھ(1770ء تا 1850ء) گوئٹے (1749ءتا 1832ء) اور ہیگل (1770ء تا 1831ء) کے حوالے سے استفادے کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن ان مفکرین سے اخذو استفادہ کا مطلب ہرگز نقالی نہیں، بلکہ اس سارے منظر نامے کو اپنے تاریخی شعور وادراک کا حصہ بنا کر اور فہم و فراست سے درست تک رہنمائی اور تخلیق نو کرنا ہے۔اقبال نے افلاطون کے افکار کو منفی خیال کیا ہے اور اس کو راہب دیرینہ اور گو سفندِ قدیم کے لقب سے پکارا ، جب کہ ا س کے شاگرد ارسطو کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ ولندیزی فلسفی اسپنوز اکو نسل یہود کا عظیم انسان اور حضرت موسیٰؑ کا تکملہ کہا ہے۔ شیکسپیئر کی تعریف میں بانگِ درا میں لکھتے ہیں:

حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا[14]

''بالِ جبریل'' میں لینن،''ضربِ کلیم'' میں مسولینی اور کارل مارکس،''پیامِ مشرق''میں شوپن ہاور ،حکیم آئن سٹائن، بائرن، نطشے، ہیگل،گوئٹے، برگساں اور ٹالسٹائی، ''جاوید نامہ'' میں طاسین مسیح کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ اس بات کا ترجمان ہے کہ اقبال نے اپنے افکار کی تدوین و تشکیل میں مخالف اور موافق ہر قسم کے نقطہ نظر کو سامنے رکھا ہے اور اپنے اس تاریخی فکر و شعور کو منطقی منزلوں سے گزار کر ردو قبول کی منزل تک پہنچا دیا۔ جرمن شاعر گوئٹے کے حوالے سے اقبال نے پیامِ مشرق میں جو مبسوط دیباچہ لکھا ہے، وہ گوئٹے کے حوالے سے اقبال کی گہری بصیرت کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے گوئٹے کے ''دیوانِ مغرب''کے جواب میں بطور احترام ''پیامِ مشرق'' لکھی۔ اقبال نے ''جلال اور گوئٹے''کے نام سے ''پیامِ مشرق'' میں نظم لکھی ہے۔ جس میں انہوں نے مولانا رومی سے گوئٹے کی فکر سخن کی داد دلوائی ہے۔ گوئٹے کے بعد سب سے زیادہ جس مغربی مفکر کا اقبال کے ہاں ذکر ہے وہ نطشے ہے۔ ''پیامِ مشرق ''میں اقبال نےنطشے کے حوالے سے کافی اشعار کہے ہیں۔ اقبال نے نطشے کا گہرا مطالعہ کیا۔ ''جاوید نامہ''میں بزبان رومی اقبال نےنطشے

کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ اقبال کی چشم بصیرت نے نطشے کے افکار سے کافی جلا پائی ہے۔ خصوصاً تصور عظمت انساں، فلسفہ خودی و سخت کوشی وغیرہ۔ لیکن اقبال نے اگر اس سےکچھ بصیرت حاصل کی تو ، بقول ڈاکٹر بجنوری:

''اسے جِلا دے کر ایک انوکھی اور نئی چیز بنا دیا ہے۔''(15)

علامہ اقبال نے دنیا کے عظیم مفکرین اور شعراء میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا ذکر اپنے کلام میں نہ کیا ہو۔ ان سب افکار و خیالات نے مل کر اقبال کے ادراک کو مہمیز کیا اور انہوں نے اپنے فلسفیانہ افکار کی تارو پود میں ان سے کام لیا۔ ان کی اس تاریخی بصیرت کے حوالے سے خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

''اقبال کے یہاں رومی بھی ہے، نطشے بھی، کانٹ بھی ہے اور برگساں بھی، کارل مارکس بھی ہیں اور لینن بھی،بیدل بھی ہیں اور غالب بھی، لیکن اقبال کے اندر ان کی حیثیت جوں کی توں باقی نہیں رہتی۔ اس نے اپنے تصورات کا قالین بنتے ہوئے کچھ رنگین دھاگے اور خاکے ان لوگوں سے لیے ہیں، لیکن اس کے مکمل قالین کا نقشہ کسی دوسرے کی ہو بہو نقل نہیں ہے۔''(16)

اقبال کی ذہنی کوزہ گری میں مغربی مفکرین کا بھی بڑا اثر رہا ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

''میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نےہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، عبدالقادر بیدل اور ورڈز ورتھ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ ہیگل اور گوئٹے نے اشیاء کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی ہے۔ بیدل اور غالب نے مجھے سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبہ اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں اور ورڈزورتھ نے طالب علمی کےزمانے میں مجھے دہریت سے بچایا۔''(17)

اقبال نے اکثر جگہوں پر اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار کے لیے سادہ اور نیچرل زندگی کا انتخاب کیا ہے۔ کیونکہ اس حالت میں دل کے بنیادی جذبات کو زیادہ بہتر زمین میسر آتی ہے۔ جس میں انسان کے جذبات قدرت کی حسین اور دائمی صورتوں کے ساتھ پیوستہ ہوتے ہیں۔ اقبال کی نیچرل شاعری میں مغربی شعراء کے شاعرانہ تصورات کی جھلک ہمیں اقبال کے مغربی ادبی تاریخی شعور کا پتہ دیتی ہے۔ اقبال نے اپنے اسی شعور کی بنا پر اشیا میں ربط تلاش کیا ہے اور عام قانون اخذ کیے ہیں، کیوں کہ ایک ہوش مند انسان کے لیے اس کا علم او رتصورات و خیالات ہی وہ بیش قیمت چیزیں ہیں جو اندرونی قوانین کو دریافت کرنے میں مدد کرتے ہیں۔

اقبال کے ہاں شاعری انسانی معاشرے کی روحانی نشاۃ الثانیہ، نئی زندگی اور نئی تازگی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ وہ شاعری کے ذریعے معاشرے کے متضاد عناصر کے درمیان انسانیت کو ابھارنا چاہتا ہے۔ اور ان کے درمیان ایک مثبت رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ مغرب میں یہی فن فرڈرش شیلر، شیلی، ٹالسٹائی اور کروچے کے ہاں نظر آتا ہے۔

اقبال کے لسانی تاریخی شعور کا سرمایہ بے پناہ وسیع ہے۔ ان کے ہاں وہ عظیم اور ناصحانہ مقدس الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو زمانہ ماضی میں دلوں کو گرماتے تھے۔ ان الفاظ کی قوت اور سحر انگیزی جادو کا اثر کرتی ہے، جو ضمیر انسانی کو جھنجھوڑتی اور خود غرضانہ جابریت کے خلاف دفاع پر اکساتی ہے۔ ان کی شاعری اعلیٰ روحانی قوتوں کو بیدا رکرتی ہے۔ اقبال کا فن انسانی ذہن کو اعلیٰ اخلاقی اقدار سے مزین کرتا ہے ۔ بلند ہمتی اور بلند پروازی اقبال کے دلپسند موضوعات ہیں۔ استغنا، بے نیازی، اپنی ذات کی پہچان یہ ہیں وہ مضامین جو در حقیقت اقبال کی شاعری کی جان ہیں۔ ان خیالات کے پیچھے مغربی ادیبوں اور ناقدین کے افکار کی گونج سنائی دیتی ہے اور اقبال کے مغربی ادبی تاریخی شعور کی خبر دیتی ہے۔ کیونکہ جس دور میں اقبال نے شاعری کی اس سے قبل کا زیادہ تر شعری سرمایہ محض طوطی و بلبل اور عارض و رخسار کی خوب صورتی کا فسانہ تھا۔ لیکن مغربی ادب کے وسیع مطالعہ نے اقبال کے تخیل کو وسیع تر کیا اور ان میں ژرف نگاہی پیدا کی۔

اقبال و مشرقی اور مغربی دونوں تہذیب کا علم اور شعور رکھتے تھے ان کے ہاں یہ اندازِ شاعری

عظیم مغربی و مشرقی شعرا کی تاریخی روایات سے با خبری نظر آتی ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال کے اسی تاریخی شعور کے حوالے سے لکھا ہے:

سینہ تھا تیرا مشرق و مغرب کا خزینہ
دل تھا تیرا اسرار و معارف کا دفینہ[18]

اقبال کے ہاں فارسی اور اردو شاعری کی بے مثال صدائے فن اور تغزل بدرجہ اتم موجود ہیں۔ لیکن ان کی فکر ان کا امتیاز اور اجتہاد ہے۔ یوں گویا انہوں نے پرانے ساغر و مینا میں نئی مے پیش کی ہے۔وہ خود اس بات کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں:

میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سر گزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو[19]

حوالہ جات

۱۔ انیس ناگی، **نیا شعری افق**،لاہور: جمالیات، اشاعت دوم، 1988ء،ص۳
۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، **تنقیدی دبستان**، لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء،ص ۱۳۶-۱۳۷
۳۔ اقبال ،"بانگ ِدرا "،مشمولہ ؛**کلیات اقبال** (اردو)،لاہور:عبداللہ اکیڈمی،۲۰۰۹ء،ص۱۲۰
۴۔ ایضا،ص۴۳
۵۔ اقبال ،"ضرب ِ کلیم"،مشمولہ ؛**کلیات اقبال** (اردو)، ص،۱۱۳
۶۔ اقبال،**جاوید نامہ**،لاہور:اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۳۲ء،ص۱۳۳
۷۔ اقبال ،"ضرب ِ کلیم"،مشمولہ ؛**کلیات اقبال** (اردو)،ص۱۲۱
۸۔ اقبال ،"بال ِ جبریل"،مشمولہ ؛**کلیات اقبال** (اردو) ،ص۸۰
۹۔ ایضاً،ص۱۲۶
۱۰۔ اقبال ،"بانگ ِدرا "،مشمولہ ؛**کلیات اقبال** (اردو)،ص۱۰۰
۱۱۔ ایضاً،ص۲۰۶
۱۲۔ ایضاً ،ص۱۸۵-۱۸۶
۱۳۔ جاوید اقبال،مرتبہ؛ **شذرات فکر اقبال**،لاہور:مجلس ترقی ادب،س ن ء،ص۱۱۸
۱۴۔ اقبال ،"بانگ ِدرا "،مشمولہ ؛**کلیات اقبال** (اردو)،ص۲۳۹
۱۵۔ محمد یوسف حسین،حکیم،**نیرنگ خیال**(اقبال نمبر)،۱۹۳۹ء،ص۱۳۶
۱۶۔ رسالہ **اردو** (اقبال نمبر)،دکن:اورنگ آباد،عبدالماجد دریا آبادی،۱۹۳۸ء،ص۱۰۱
۱۷۔ جاوید اقبال،مرتبہ؛ **شذرات فکر اقبال**،ص۱۰۵
۱۸۔ عبدالحکیم،خلیفہ،**فکر اقبال**،لاہور:بزم اقبال،۱۹۸۸ء،ص ن
۱۹۔ اقبال ،"بال ِ جبریل"،مشمولہ ؛**کلیات اقبال** (اردو) ،ص۱۰۸